

دوسرا زبردست حادثہ جو ان دنوں ہماری قوم کو پیش آیا گوہ حیدر آباد کا سقوط ہے۔ اس معاملہ میں انڈین یونین اور اس کے لیڈروں نے جو ٹریناک پارٹ ادا کیا ہے اس سے بحث کرنا ہمارے لئے لافاصل ہے۔ ہندوستان میں اگر کچھ عقل و ہوش رکھنے والے لوگ موجود ہیں تو یہ دیکھنا ان کا کام ہے کہ ان کی قوم کدھر جا رہی ہے اور کہاں پہنچ کر رہیگی۔ ہم اپنی بحث کو معاملہ کے صرف اس پہلو تک محدود رکھنے کے جس کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔

حیدر آباد میں چند لاکھ ہندوستانی مسلمانوں کی ہجرت کے بعد مسلمانوں کی آبادی تقریباً چالیس لاکھ تھی۔ یہ چالیس لاکھ مسلمان ایک ایسی ریاست میں آباد تھے جس میں غیر مسلموں کی آبادی سوا کروڑ سے بھی زیادہ تھی۔ پھر اس ریاست کو چاروں طرف سے ایک ایسی مملکت گھیرے ہوئے تھی جس کی آبادی ۲۰ کروڑ سے زائد ہے اور جس حکمرانی اسی غیر مسلم اکثریت کی ہے جو خود ریاست میں بھی اکثریت ہی رکھتی ہے۔ والی ریاست انہی والیان ریاست کی جنس سے تعلق رکھتا تھا جو اپنی گدی اور اپنے خاندان کے مفاد کو بہر حال اپنی پوری قوم کی نسبت عزیز تر رکھتے ہیں۔ فوج، پولیس اور نظم و نسق کے تمام شعبوں میں اگرچہ مسلمانوں کا غلبہ تھا، مگر غیر مسلم عنصر بھی کچھ ایسا بے اثر نہ تھا کہ حکومت کی انتظامی مشین کو بالکل مسلمانوں کی حمایت میں استعمال کیا جاسکتا۔ تقسیم ہند کے وقت تک ریاست پر انگریزوں کی بالادستی مسلط رہی تھی اور اس نے دوسری ریاستوں کی طرح حیدر آباد کو بھی ایسا کوئی موقع نہ دیا تھا کہ وہ اپنی فوجی طاقت مضبوط کر سکے۔ تقسیم کے بعد حیدر آباد انڈین یونین کے گھیرے میں اچکا تھا، اس لئے نہ باہر سے کوئی بڑی مدد اس کو پہنچ سکتی تھی اور نہ اندری اس کا کوئی امکان تھا۔ چند مہینوں میں وہ اتنی جنگی طاقت فراہم کر سکے جو ہندوستان سے لڑنے کے لئے کچھ بھی کافی ہو۔ اخلاقی حیثیت سے بھی حیدر آباد کے مسلمان کچھ ایسے بتر نہ تھے کہ کوئی شخص یہ تصور کر سکتا کہ وہ اپنے سے سترگنی طاقت کا مقابلہ کر سکیں گے، اور اس کا بھی کوئی امکان تھا کہ پاکستان اپنے موجودہ حالات میں ان کی حمایت کے لئے اٹھ سکے

یہ تھے حیدر آباد کے اصل حالات۔ ان حالات میں کوئی ہوشمند انسان یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں

۸۵ فیصدی غیر مسلم اکثریت پر ۹۰ فیصدی لم اقلیت کا وہ غلبہ و اقتدار برقرار رکھا جاسکتا ہے جو پہلے بالکل مختلف حالات میں قائم ہوا اور رہا تھا۔ اور کسی مردِ عاقل سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ حیدرآباد انڈین یونین سے لڑوس کے علی الرغم اپنی ہر دستاویزی تمام نہیں رکھ سکتا۔ دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان کشاکش، مزاحمت اور جنگ کے بجائے اپنے مستقبل کے لئے کوئی ایسی راہ تلاش کرتے جس میں وہ کامل تباہی سے بچ بھی سکے اور آئندہ اپنی اخلاقی و دینی حالت کو بہتر بنا کر کوئی نتیجہ خیر جو وجدہ کرنے کے مواقع بھی انھیں حاصل رہتے۔ لیکن جن لوگوں نے ایسی کوئی راہ سوچی اور بتائی وہ مسلمانوں کو دشمن نظر آئے۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کے لئے ایسے لوگوں کو پسند کیا جو اندھے جوش، کھوکھلے نعروں، جھوٹی توقعات، غلط امیدوں، بے بنیاد آرزوؤں، اور بے زور لاف و گزاف کے ذریعہ سے ان کے غرور نفس کوئی الوقت تسکین دے سکیں۔ وہ اس آواز پر مڑے کہ کوئی دلی کے لال تلہ پراسف جاہی جھنڈا گاڑ دینے کو، بات تو کرتا ہے۔ اس نشے میں چالیس لاکھ کی پوری آبادی مست ہو گئی۔ کوئی یہ سوچ کر اپنے وقتی لطف کو کرکرا کرنے پر راضی نہ ہوا کہ آخر یہ کام ہوگا کس طرح؟ سب کے سب، آنکھیں بند کر کے اس لاف زنی کے پیچھے چل پڑے اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے کہ اس گئے گزے زلمے میں بھی انہیں ایسے بے نظیر نیڈر میسر آئے ہی چلے جاتے ہیں!

یہ تو تھی حیدرآباد کے مسلمانوں کی کیفیت۔ رہے پاکستان کے مسلمان تو ان کی کیفیت بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھی۔ سیاسی تقسیمات نے چاہے ہم کو کتنا ہی بانٹ دیا ہو، مگر قوم اور اس کا مزاج تو ایک ہی ہے۔ یہاں ہمارے اخبارات وہ ساری نشہ آور تقریریں پھیلا رہے تھے جن سے حیدرآباد کے لوگوں پرستی کا عالم طاری کیا جا رہا تھا۔ حیدرآباد کی روز افزوں طاقت اور اس کی زبردست تیاریوں کے متعلق طرح طرح کے افسانے نہ معلوم کہاں تصنیف ہوتے تھے اور عام لوگوں تک پہنچا دئے جاتے تھے۔ کبھی ہمیں سنایا جاتا تھا کہ حیدرآباد کے پاس بڑا بھاری ہوائی بیڑہ موجود ہے۔ کبھی کہا جاتا تھا کہ اس نے گوآ کی بند گاہ حاصل کر لی ہے۔ کبھی خبر دی جاتی تھی کہ اس نے فرانس سے ایک جزیرہ حاصل کر لیا ہے۔ کبھی اس کی فوجی طاقت اور جنگی سروسا ان کے متعلق سراسر بے سرو پا

انڈاز سے شائع کئے جاتے تھے۔ کبھی بتایا جاتا تھا کہ دنیا نے اسلام کے گوشے گوشے میں اس کی مدد کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان باتوں سے محض عوام الناس ہی نہیں، ہمارے اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ اور ذمہ دار منصب رکھنے والے اصحاب تک جموٹی اُمیدوں اور غلط توقعات کے قلعے بنا کر بیٹھ گئے تھے۔ حتیٰ کہ جس روز شام کو حیدرآباد ہتھیار ڈالنے والا تھا اس کی دوپہر تک ہمارے خطیب اپنے جمعہ کے خطبوں میں اپنی قوم کو یقین دلائے جا رہے تھے کہ عنقریب لڑائی کا نقشہ بدلنے والا ہے اور اس کے بعد..... بس دیکھنا کہ کیا ہو جائیگا۔ پھر جب تلخ حقائق کی ایک ضرب نے وہ تمام خیالی قلعے یک نخت نہدم کر دیے جو ہوا باندھ باندھ کر پچھلے ایک سال سے تعمیر ہو رہے تھے، تو اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

آج حیدرآباد میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تصور سے ہر مسلمان کا دل غمگین ہے۔ جہاں سات آٹھ سو برس تک مسلسل مسلمانوں کا غلبہ رہا آج وہاں مسلمان صرف مغلوب ہی نہیں پامال ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کی وسیع سرزمین میں وہ ایک خطہ بھی اب باقی نہیں رہا جہاں مسلمان عزت سے سراٹھا کر چل سکتا تھا۔ کل تک جس حیدرآباد کی طرف سارے ہندوستان کے مسلمان اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے، افسوس! آج وہی حیدرآباد ہر طرف مایوسی ہی مایوسی دیکھ رہا ہے۔ اس کے عزت والے ذیلیں ہو رہے ہیں۔ اس کے بہترین نوجوان ضائع کئے جا رہے ہیں اور اس کی طاقت اس طرح توڑی جا رہی ہے کہ شاید چند سال بعد ہندوستان میں کسی خطے کے مسلمان اتنے خستہ حال نہ ہوں گے جتنے حیدرآباد کے مسلمان۔

اپنے بھائیوں کے اس انجام پر ہمارا غم و افسوس صحیح۔ انڈین یونین کی بد عہدیوں اور کم ظرفیوں اور خرمستیوں پر ہمارا غصہ بجا۔ بھارتی حکومت کے غدارانہ رویہ پر ہماری شکایت درست۔ اور نظام کی خود غرضی پر بھی ہمارا غیظ و غضب برحق۔ مگر ہم کسی اس طرح کی ٹھوکریں کھانے اور چوٹیں سہنے سے نہیں بچ سکیں گے جب تک کہ خود اپنی ان غلطیوں کو محسوس نہ کریں جن کی بدولت یہ پے درپے

زکیں نہیں اٹھاتی پڑ رہی ہیں۔ ہم حقائق سے منہ موڑ کر آرزوؤں اور تمناؤں کے پیچھے چلتے ہیں۔ ہم عقل کی بات بتانے والوں کو دشمن اور خوش کن باتیں بنانے والوں کو دوست سمجھتے ہیں۔ ہم ٹھوس عمل کی کمی کو خیالی ہواؤں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نصیحت سے نفور اور کذب و فریب کے قدرداں ہیں۔ ہم کسی کو اپنے آگے لگاتے وقت اس کے اخلاقی و ذہنی اوصاف نہیں دیکھتے بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نعرہ کتنے زور کا لگاتا ہے اور زبان کے استعمال میں کس قدر مطلق العنان ہے۔ ہم اپنے رہبروں اور سربراہ کاروں کے انتخاب میں سیم غلطیاں کرتے رہے ہیں اور اندھی پیری کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ تباہ کن حوادث میں مبتلا ہونے سے پہلے کبھی آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے کہ ہمارے رہبر ہمیں کدھرنے جا رہے ہیں۔ ہماری ہی کمزوریاں دراصل ہماری سب سے بڑی دشمن ہیں۔ کسی باہر والے کی دشمنی اور کسی گھروالے کی غداری ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکتی اگر ہماری اپنی یہ کمزوریاں اس کی مدد نہ کرتیں۔ اب بھی ہم انہیں سمجھ لیں اور ان کی اصلاح پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حیدر آباد کا خون رائیگاں نہ گیا۔ لیکن افسوس کہ سقوط حیدر آباد کے بعد فوراً ہی ہم نے اس کی ایسی توجیہات شروع کر دیں جن سے اپنی کمزوریوں کے سوا ہر دوسری ممکنہ تصویر چیز پر اس حادثہ عظیم کی ذمہ داری ڈالی جاسکے۔ گویا ہم اپنے نفس کو یہ اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ ہم خود تو سب کچھ ٹھیک ہی کر رہے تھے، صرف فلاں کی غداری اور فلاں کی بے وفائی نے ہم کو اس حادثہ سے دوچار کر دیا۔ — حقیقت یہ وہ ایفون کی گولیاں ہیں جو ہر چوٹ کے بعد ہم اس لئے کھایا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی خامیوں کا تلخ احساس نہ ہونے پائے!

قدیم زمانے میں اقتدار و اختیار کا مرکز بادشاہ ہوتے تھے اور اجتماعی زندگی کے سارے کاٹھانے کی دستی یا خرابی کا انحصار اس پر ہوتا تھا کہ وقت کا بادشاہ کیسے ہے۔ بادشاہ عقلمند اور نیک مزاج ہوتا تو وہ اپنے گرد و پیش اچھے مشیر، راست باز علماء، دانشمند مدبر، اور دیانتدار کارکن جمع کر لیتا تھا اور سب کام ٹھیک چلتے تھے۔ لیکن اگر تخت نشاہی پر کوئی بگڑا ہوا شاہزادہ متمکن ہو جاتا تو اسے

خوشامدی مصاحب ہر طرف سے گھیر لیتے تھے اور وہ اسے بھڑوں پر چڑھا کر غلطیوں کے چکر میں ایسا پھلانتے تھے کہ صرف شاہی خاندان ہی نہیں بلکہ پوری مملکت تباہی و بربادی کی راہ پر چل پڑتی تھی۔ سلطنت کمزور ہوتی تھی اور وہ بادشاہ کو یقین دلاتے تھے کہ حضور کی طاقت آسمان پر جا رہی ہے۔ دشمن سر پر ہوتا تھا اور وہ بادشاہ کو المیہ مان دلاتے تھے کہ حضور کا اقبال سب کا منہ پھیر دیگا۔ بادشاہ کے کانوں تک وہ کوئی صحیح رائے، کوئی نیک مشورہ، اور کوئی حق بات نہ پہنچتے دیتے تھے۔ دربار میں مانگ ہی ان لوگوں کی ہوتی تھی جو بادشاہ کو دھوکے اور فریب میں مبتلا رکھیں، اس کو جھوٹ سے خوش کریں، اس کی کمزوریوں کو خوبیاں بتائیں، اس کے گناہ کو صواب ٹھہرائیں، دنیا کی ساری حقیقتوں کو اس کی خواہشات کے مطابق ڈھالیں اور کسی تلخ حقیقت سے اس کے عیش کو بدمزہ نہ ہونے دیں۔ اس ماحول میں کوئی ناصح مشیر، کوئی حق گو عالم، کوئی دور اندیش اور معاملہ فہم انسان اور کوئی مخلص و متدین ملازم بادشاہ کے پاس نہ پھٹک سکتا تھا، اور اگر اتفاق سے کوئی ایسا آدمی نکل بھی آتا تو بداندیشوں کی پوری ٹولی مل کر اپنا سارا زور اس کے خلاف لگا دیتی تھی تاکہ بادشاہ کا مزاج اس پر برہم ہو جائے اور اسے دربار سے نکال باہر کیا جائے۔ پھر جب یہ ساری خرابیاں مل جل کر سلطنت پر کوئی بڑی آفت لے آئیں تو افیون کے بہت سے انٹے اور شراب کے ساغر اور بھنگ کے پیالے تیار رکھے جاتے تھے تاکہ اعلیٰ حضرت کی آنکھیں کھلنے سے پہلے نہیں غفلت میں سرشار کر دیا جائے۔

آج اس جمہوریت کے دور میں عوام کا وہی مقام ہے جو پہلے بادشاہوں کو حاصل تھا۔ اقتدار و اختیار کا منبع اب بادشاہ نہیں، ملک کے عوام ہیں۔ زندگی کا سارا نظام اسی وقت ٹھیک چل سکتا ہے جبکہ عوام انسان کا شعور درست ہو، ان میں بھلے اور بے سے کی تمیز ہو، اور وہ ٹھیک ٹھیک سمجھیں کہ کس پر اعتماد کرنا چاہیے اور کس پر نہ کرنا چاہیے۔ بیانات جہاں نہ ہوگی وہاں وہی صورت حال رونما ہوگی جو پہلے شخصی بادشاہی کے دور میں کسی گمبے ہوئے شاہزادے کے تخت نشین ہونے پر رونما ہوا کرتی تھی۔ اب مصاحبوں کا زمانہ نہیں ہے ان کی جگہ اب گراہن اخباروں اور بے لگام خطیبوں اور الیکشن کے کھلاڑیوں اور دنیا پرست مولویوں نے لے لی ہے۔ پہلے گمبے ہوئے عوام ان کو پسند کر کے ابھارتے ہیں، پھر یہ ابھکر عوام کو اور زیادہ بگاڑتے چلے جاتے ہیں۔